جدید اردو نظم کا سیاسی و مزاحمتی استعارہ: حبیب جالب

Political and resistance metaphor of modern Urdu poetry: Habib Jalib

[1] محمد عمران شاہد [2] ڈاکٹر مظہر عباس

Abstract:

Poetry and Literature emerge under social needs. In crisis and unethical societies, Literature wows for the reforms and betterment. This betterment may be in social values, ethics, economics and politics. In the new-born society of Pakistan, establishment and political parties tried to overwhelm the powers and extend their spheres. At this time A Poet, Habib Jalib raised the voice for political, social, economic and cultural reforms. The purpose of this article is to throw light on the economic, social and cultural causes and motives of Habib Jalib Poetry in reactionary perspective.

Keywords: Urdu Poetry, Modern Urdu Poem, Politics, Habib Jalib.

شاعری اور ادب سماجی ضروریات کے تحت ابھرتے ہیں۔ بحرانوں اور غیر اخلاقی معاشروں میں ادب اصلاح اور بہتری کے لیے واہ واہ کرتا ہے۔ یہ بہتری سماجی اقدار، اخلاقیات، معاشیات اور سیاست میں ہوسکتی ہے۔ پاکستان کے نوزائیدہ معاشرے میں اسٹیبلشمنٹ اور سیاسی جماعتوں نے طاقتوں کو زیر کرنے اور اپنے دائرے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس وقت ایک شاعر حبیب جالب نے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی اصلاحات کے لیے آواز اٹھائی۔ اس مضمون کا مقصد حبیب جالب کی شاعری کے معاشی، سماجی اور ثقافتی اسباب و مقاصد پر رجائی و مزاحمتی تناظر میں روشنی ڈالنا ہے۔

کلیدی الفاظ: اُردو شاعری، جدید اُردو نظم، مزاحمت، سیاست، ترقی پسندی، حبیب جالب

ادب انسانی زندگی کا عکاس بھی ہے اور اِس کو براہ راست متاثر بھی کرتا ہے اور معاشروں کو شعور و آگہی فراہم کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ ادب کی بنیاد قوتِ متخیلہ پر رہی ہے۔ شاید اس لیے اس میں متحرک رہنے اور تبدیلی کو قبول کرنے کا عنصر غالب رہا ہے۔ ادب کے مزاج جو تبدیلی اور بے چینی کا رنگ پایا جاتا ہے اکثر اوقات یہی بغاوت اور مزاحمت میں ڈھل جاتا ہے۔ جب ہم عالمی ادبی سرمائے کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کوئی ایسا ادیب یا شاعر نظر نہیں آتا ہے جس کے دل و دماغ کو اُس دور کے رویوں اور حالات کے ظلم و جبر نے نہ جھنجوڑا ہو اور اسکے قلم سے سیاہی کے بدلے خون نہ ٹپکا ہو۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب میں مزاحمت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ بعض محققین کے خیال میں ادب کی مزاحمتی اور غیر مزاحمتی لحاظ سے جو درجہ بندی اور تقسیم کی

---

۱ پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور
۲ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

جاتی ہے وہ غلط ہے کیوں کہ ادب بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔ غور کریں تو معنیات کے اشتقاقی اصول کے مطابق، "مزاحمت" کی اصطلاح اردو لفظ "مزاحم" سے مشتق ہے۔ مزاحم کے معنی روڑے ڈالنا، خلل انداز ہونا، رخنہ انداز ہونا، اور سد راہ یعنی دیوار بننا کے ہیں۔

مزاحمت کا انگریزی متبادل Resistence ہے۔ جو فرانسیسی "Resister" اور لاطینی "Resistere" سے مشتق ہے۔ معنوی اعتبار سے لفظ مزاحمت کے لغوی معنی "اطاعت کرنے سے انکار" ہے۔ آکسفورڈ ایڈوانس لغت کے مطابق مزاحمت کسی خیال، کسی تصور یا کسی فیصلے کی مخالفت کا عمل ہے اس مخالفت میں اسے ہونے سے روکنے کی کوشش بھی شامل ہے گویا مزاحمت ایک مضبوط اختلاف کا اظہار ہے۔ اس طرح "مزاحمت" بنیادی طور پر ایک انقلابی سرگرمی ہے۔ مزاحمت تسلط، ناانصافی اور جبر کے خلاف محکوموں کی آواز ہے۔ مزاحمت کا مقصد ظالمانہ طریقوں کو بے نقاب کرنا، استبدادانہ طاقت کو کمزور کرنا اور عام لوگوں کے لئے ایک مساوی جگہ تلاش کرنا ہے۔ مزاحمت درحققیقت ان سماجی و ثقافتی رویوں کے جبری استحصال سے انکار کا نام ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتے ہیں۔ جب ادیب اپنے گرد و پیش کے ساتھ مکمل ہم آہنگی نہیں کر پاتا تو اس کا اظہار ادبی تخلیقات کے ذریعہ کرتا ہے اگر اس حوالے اور نظریئے سے دیکھا جائے تو سارا ادب مزاحمتی ادب ہے اور ہر ادیب مزاحمت کار ہے۔ ادب میں مزاحمتی رویہ کب پیدا ہوتا ہے اس بارے میں ابرار احمد لکھتے ہیں:

> ''ہر سماج میں بالا دست طبقے عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں کبھی ریاست اور کبھی مذہب کے نام پر، کبھی سیاست اور کبھی معیشت کے نام پر۔ ان استحصالی قوتوں کے ہاتھ جھٹک دینے کے لئے مزاحمتی عمل جاری رہتا ہے۔ ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گرد و پیش سے Conform نہیں کر پاتا اور اسی کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔''(1)

مزاحمت اور بغاوت کا اظہار یونانی ادب میں واضح طور پر ملتا ہے۔ قدیم یونان میں جو جمہوری مزاج

تھا،اس نے ادب میں مزاحمتی رویوں کے لئے گنجائش پیدا کی اور مزاحمتی ادب کی شروعات ہوئی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح پہلی بار ۱۹۶۱ء میں فلسطینی مصنف غسان کنفانی نے اپنی کتاب ''مقبوضہ فلسطین میں مزاحمتی ادب''میں ''مزاحمت'' کے نام سے کی۔ جبکہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ''مزاحمتی ادب '' کی اصطلاح سب سے پہلے '' باربرا ہارلو Barbara Harlow '' نے متعارف کرائی۔ لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح عہدِ آمریت میں وجود میں آئی۔ اس طرح ایک جانب ویت نام، فلسطین، الجزائر اور کشمیر کی آزادی کے لئے لکھا گیا ادب مزاحمتی ادب کہلایا تو دوسری جانب ایشیائی آبادی کی حوصلہ افزائی میں تحریر کردہ ادب بھی مزاحمتی ادب شمار کیا گیا۔ اہلِ قلم نے ہمیشہ ظلم وجبر کے اندھیروں کے خلاف حق اور سچائی کے چراغ روشن کیے ہیں۔ ہر سچا شاعر اور ادیب مظلوم کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔

ادب اور سیاست کا بھی آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ایک ادب ہی ہے جو زندگی سے مضبوطی، خوب صورتی اور سلیقۂ ترتیب حاصل کرتا ہے اس بات کو پیشِ نظر رکھیں تو زندگی کے مضبوط مظاہر جن میں سیاست بھی شامل ہے۔ ادب کو براہ راست متاثر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سیاست معاشرے کی مقتدر قوت ہونے کی وجہ سے ادب سمیت زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کو براہ راست متاثر کرتی ہے۔ مجموعی معاشرتی اور مدنی ماحول کی تشکیل میں سیاسی عناصر اور عزائم بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ منفی سیاسی اقدار معاشرے پر برے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ جب کہ مثبت سیاسی اقدار ریاست کو فلاحی ریاست کی طرف لے جاتی ہیں اور اس سے ادب سمیت زندگی کا ہر شعبہ اس بات کی توقع بھی رکھتا ہے۔ ژاں پال سارتر سیاسی عمل سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''فرانسیسی مفکر اور ادیب ژاں پال سارتر سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک ادب اور سیاست کا کیا رشتہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ سیاسی عمل کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے جس میں ادب آزادی اظہار کر سکیں۔''(2)

ہم کہہ سکتے ہیں کسی دور کا ادبی ماحول ایسا نہیں رہا ہے کہ اُس نے اپنے گردو پیش سے کوئی اثر نہ لیا ہو

ہر دور میں کوئی نہ کوئی تحریک یا سیاسی عمل ایسا رہا ہے جس نے ادب اور ادیب پر اپنا اثر چھوڑا ہے خاص کر سیاست نے ادب کو خاصا متاثر کیا ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار ایسا نہیں گزرا جس نے اپنے عہد اور سماج سے بیگانہ ہو کر کچھ لکھا ہو۔ کیوں کہ ادیب، ادب اور سیاست کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ کوئی بھی ادب پارہ اس وقت تک بڑے ادب میں شمار نہیں ہو سکتا جب تک اُس سے سماج کا عکس دیکھائی نہ دے۔ اسی بات کو ڈاکٹر سلام سندیلوی یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔۔ادب پر اس دور کے سماج کی تحریکات کا اثر پڑتا ہے اور عوام کے رجحانات کا ہوتا ہے۔''([3])

ہر ادیب و تخلیق کار کا سیاست کے متعلق اپنا خیال اور نظریہ ہوتا ہے اسی کی بنا پر وہ سیاست کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ کچھ ادیب اتنے دور اندیش ہوتے ہیں کہ وہ سیاست کے بارے اپنا نظریہ رکھتے ہیں اور اس سے پورا سیاسی دھارا ہی متاثر ہوتا ہے۔ اور کچھ ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں جو پہلے بنے بنائے راستوں پر چلتے ہیں پہلے سے موجود سیاسی و سماجی نظریات کے ساتھ ہیں اُن کا ذہنی و قلبی میل جول ہوتا ہے اسی کو ہی لے کر وہ آگے چلتے ہیں۔ یعنی کوئی بھی ادیب سیاسی شعور سے ماورا نہیں ہو سکتا وہ جب بھی عوامی مسائل یا حکمرانوں کی خامیوں کو بیان کرے گا تو اُس ادیب کی تخلیق میں نہ چاہتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں سیاست جھلک پڑے گی۔

حبیب جالب وہ شاعر ہیں جو ترقی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ مزاحمتی و سیاسی رنگ میں رنگے غالب نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں پر شاعری نعرہ بنانے کا الزام ہمیشہ سے رہا ہے لیکن حبیب جالب ایسے شاعر تھے جو نعرے کو شاعری بنانے کا فن جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عام ترقی پسند شعرا کے مقابلے میں زیادہ براہ راست انداز اختیار کرنے کے باوجود ایک پُر اثر شاعر تھے۔ حبیب جالب ہمارے شعری اُفق پر اُس وقت نمودار ہوئے تھے جب قائدِ اعظم کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ تحریکِ پاکستان میں سر گرمِ عمل تھی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر حبیب جالب ایک رومانی شاعر سے انقلابی شاعر کی منزل کی جانب گامزن ہو گیا تھا۔ حبیب جالب کی شاعری کا آغاز بھی رومانوی انداز کی حامل غزلوں سے ہوا تھا۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ "برگ آوارہ" اُن کے لیے

مقبولیت کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن حبیب جالب نے رومانویت کی راہ ترک کر کے ترقی پسندی کا راستہ اپنا لیا وہ سیاسی و سماجی اور عصری شعور پر مشتمل نظمیں لکھنے لگے جو عوام کے لیے عام فہم، واقعاتی اور سیاسی و مزاحمتی ہونے کے ساتھ ساتھ پُراثر بھی تھیں۔ طلوعِ پاکستان کے بعد جب تحریکِ پاکستان کے خواب و خیال فراموش کر دیے گئے تب حبیب جالب کی شاعری انقلابی سیاسی عمل کی نغمہ گری بن گئی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے احتجاج کی آواز کو خواص نے بھی اہمیت دی اور عوام نے اُس کو قبولِ عام بخشا اور ایوان کی دیواروں سے بھی ٹکرائی۔ حبیب جالب کی اس مقبولیت کے دو اسباب بیان کرتے ہوئے احمد جاوید لکھتے ہیں:

> "ہم کسی بھی بحث میں پڑے بغیر نہایت آسانی سے اس کے قبول عام کو ان دو اسباب کے آئینے میں روشن دیکھ سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس نے اُس وقت احتجاج کی آواز بلند کی جس وقت کہ اس آواز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اور دوسرا یہ کہ اُس کی شاعری اور زندگی کے قرینے میں کہیں کوئی بُعد نہیں تھا"(4)

قیامِ پاکستان کے بعد حکومتیں عوامی توقعات پر پورا نہ اتر سکیں ایوان شاہی میں سازشوں کے جال بچھنا شروع ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آمریت کے دور کا آغاز ہوا۔ ملک میں جمہوریت کا جنازہ نکل چکا تھا ہر حساس شخص اپنے اپنے انداز میں مزاحمت کر رہا تھا۔ باقی شعراء کی طرح حبیب جالب نے بھی ان حالات کو دیکھا، محسوس کیا اور لفظوں میں بیان کر دیا۔ حبیب جالب اور اُس دور کے دوسرے ترقی پسند و سیاسی شعرا میں یہی ایک فرق نمایاں ہے کہ حبیب جالب سیاسی و فکری وابستگی کا عملی مظاہرہ تھے۔ اس لیے وہ معاشرتی و سماجی بھلائی کے خاطر ہر اُس دیوار سے عملی طور پر ٹکراتے رہے جس کو وہ سماجی ارتقا کی راہ حائل سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بڑا واضح فرق محسوس ہوتا ہے کہ حبیب جالب نے تن تنہا کوششوں سے اپنی شاعری اور عملی زندگی میں مزاحمتی سوچ اور خیالات کی ترویج کی ان تھک جدوجہد کی۔ ایوب خان کا مارشل لاء ہو یا ضیاء کی آمریت کا دور، حبیب جالب تنہا ان آمروں کے خلاف آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ اُس وقت اُن کی جرات اور بے باکی کو سلام کرنے کو دل چاہتا ہے جب پاکستان پر ایوب آمریت کے تسلط کے خلاف حبیب جالب نے

اپنے سیاسی عمل سے پھوٹتی ہوئی شاعری سے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ جب ایوب نے اپنے چند ملازموں کا لکھا ہوا آئین جاری کیا تو اُس کے خلاف سب سے مؤثر احتجاج حبیب جالب کی نظم ''دستور'' کی عوامی مقبولیت کی صورت میں سامنے آیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل سے معاشرے میں ظلم و جبر کے خلاف سیاسی شعور پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں اور ایوب کے بنائے ہوئے دستور کو مسترد کرنے کا اعلان بغیر کسی خوف و خطر بانگ دہل یوں کرتے ہیں:

میں بھی خائف نہیں تختہ دار سے
میں بھی منصور ہوں قید و اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا (۵)

حبیب جالب ایوانوں میں ہونے والی ہر چالاکی کو بھانپنے کی سکت رکھتے تھے اُن کا سیاسی شعور بہت گہرا تھا ساتھ ساتھ وہ طبقاتی اونچ نیچ سے بھی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ غریبوں کا استحصال کیسے کیا جا رہا ہے اور کس طرح اس کے بچوں رُلایا جائے گا، اُن کے گھروں کے دیے کیسے گل کیے جائیں گے۔ اور پسے ہوئے طبقے کو اُن کے حقوق سے محروم رکھنے کے لیے ایوانوں میں بیٹھنے والے لوگ اُن کے لیے کیسی کیسی قانون سازیاں کر رہے ہیں۔ اپنی عیش پرستی کے لیے کس طرح راستے ہموار کر رہے ہیں ان ساری باتوں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نُور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا (۶)

حبیب جالب نے اسی طرز میں اسلام کے مقدس نام پر مفاد پرست ٹولے، استحصال پسند حکمرانوں

اور عوام دشمن سیاسی گروہوں کو عوام کے دل میں اُتر جانے والی زبان میں للکارا اور یوں اسلام کے معاشی انصاف اور معاشرتی مساوات کے تصورات غریب اور غیر تعلیم یافتہ عوام کے دل میں اُترتے چلے گئے یعنی لوگوں کو آگہی حاصل ہو گی کہ اسلام کا سیاسی و معاشرتی نظام کیسا ہے اور ہمارے حکمران کیسا بتارہے ہیں۔ معاشی ناہمواری کے باعث دولت کے فقط چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جانے کے خلاف حبیب جالب کی شاعری میں سے ایک نظم ''بیس گھرانے'' غریب اور اَن پڑھ عوام کے لبوں پر بھی جاری و ساری ہو گئی تھی۔ صرف آغاز کے چند مصرعوں میں ہی آمریت اور سرمایہ پرستی کے بھیانک اثرات نمایاں تر ہو گئے ہیں اور حبیب جالب کی مزاحمتی شاعری کا واضح ثبوت نظر آتا ہے:

بیس گھرنے ہیں آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب زندہ باد
آج بھی ہم پر جاری ہے
کالی صدیوں کی بیداد
صدر ایوب زندہ باد ۷

حبیب جالب کی شاعری جب عوام کی زبان پر عام ہو گی تو ایوب خان کو اپنی سیاسی بقا قائم رکھنا مشکل ہو گی تو اُن کو اپنا اقتدار بہ امرِ مجبوری جنرل یحییٰ خان کے سپرد کرنا پڑا تو یحییٰ خان نے عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو سیاسی میدان میں اترے تو انھوں نے وطن کے ہر شہری کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کا اعلان کرتے ہوئے "سوشلزم" کو پاکستان کا نظامِ معیشت قرار دیا۔ اس پر اسلامی سوشلزم کے تصور پر ہر طرف ایک بحث چھڑ گئی۔ محمد حنیف رامے نے اپنے رسالہ "نصرت" میں اسلامی سوشلزم کو "مساواتِ محمدی ﷺ" سے تعبیر کیا یعنی نبی ﷺ کا نظامِ معیشت اس کے مطابق تھا۔ "نصرت" کے اسلامی سوشلزم نمبر کی تردید میں پروفیسر خورشید احمد نے ماہنامہ "چراغِ راہ" کا اسلامی سوشلزم نمبر شائع کیا جس میں "سوشلزم" کو

اسلام مخالف آئیڈیالوجی ثابت کیا گیا۔ انتخاب سر پر تھے اس لیے جماعتِ اسلامی اور دائیں بازو کی جماعتوں نے اپنی اپنی انتخابی مہم کو کامیاب کرنے کے لیے اپنے جلسوں میں 'اسلام خطرے میں ہے' کی دُھائی دی۔ اس پر حبیب جالب نے دونوں جماعتوں للکارتے ہوئے اور دادِ سیاست اور دادِ سخن دیتے ہوئے 'خطرے میں اسلام نہیں' کے عنوان سے ایک مقبول نظم لکھی جو اُن کے سیاسی اور مذہبی شعور کو جلا بخشتی ہے وہ کہتے ہیں:

خطرہ ہے زرداروں کو
گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو
خطرے میں اسلام نہیں
ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہیں
آخر چند گھرانے کیوں؟
نام نبیؐ کا لینے والے
اُلفت سے بیگانے کیوں؟ ۸

حبیب جالب ذوالفقار علی بھٹو کے نظام کو پسند کرتے تھے۔ وہ پاکستان میں برابری کے نظام کے حق میں تھے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بجائے اپنے وسائل بروکار لانے کی طرف ترغیب دیتے اور دولت کی منصفانہ تقسیم چاہتے تھے۔ جب بھٹو نے سوشلزم کے نظام کا نعرہ لگایا تھا بہت سے علماء نے اُس نظام کی مخالفت کی، بھٹو اور سوشلزم نظام کے خلاف فتوی دیے تو حبیب جالب نے تب "علمائے سُو کے نام"، "مولانا" کیسی نظمیں لکھیں اور ان نظموں میں اسلام کی غلط تفسیر و تعبیر کرنے کو رد کیا مولویوں کے فتویوں کا جواب دیا بل کہ اُن کے بھیانک تصور کو کہ دولت جس کے پاس ہے اُسی کی ہے کو اُن کے منہ پر مارا اور بھٹو کے نظام سوشلزم کے حق شاعری کر کے اسلام کی سچی انقلابی تعبیر پیش کرنے کو شش کی جو عوام کی آواز بن گی۔ حبیب جالب کی ایسی نظمیں ہماری عوامی جمہوری تاریخ کے وہ درخشاں ابواب ہیں جو تاریخ کی کتابیں سے تو غائب ہیں مگر عوام کے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ یہ نظمیں نظریاتی تصادم کی سی صورتِ حال میں اسلام کی

انقلابی روح اور حبیب جالب کی نظریاتی پختگی کی تابندہ مثال ہیں۔اسی سلسلہ خیال کی اُن کی ایک نظم "پاکستان کا مطلب کیا؟"عوام کا نعرہ بنی ہے:

روٹی، کپڑا اور دوا
گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت مجھے تعلیم دِلا
میں بھی مسلماں ہوں واللہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ
کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ ۹

حبیب جالب کی زندگی کا ایک حصہ آمریت کے خلاف جنگ لڑتے گزرا ہے۔انہوں نے ہمیشہ جمہوریت اور حق کا ساتھ دیا ہے۔جمہوریت کے مظلوموں کے ساتھ وہ کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہوئے ہیں۔اور آمریت کو ہر دور میں للکارتے رہے ہیں۔جب آمرِ مطلق ایوب خاں کو اپنی بنیادی جمہوریت کے تحت انتخابات کرانا پڑے تو اُس کے مقابلے میں اپوزیشن نے متحد ہو کر مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کو اپنا مشترکہ نمائندہ قرار دیا۔مادرِ ملت کے انتخابات کی سیاست میں اُترتے ہی نوجوان اُن کی قیادت میں سر گرمِ عمل ہو گئے۔ایوب خان کو اس میں اپنی توہین محسوس ہوئی تو پکڑ دھکڑ مار کٹائی کا بازار گرم کر دیا گیا۔لاٹھی گولی کی سرکار نے نوجوانوں کو لہو میں نہلانا شروع کر دیا۔اس پر مادرِ ملت کے احتجاجی سیاسی عمل کو حبیب جالب نے اپنی نظم

بعنوان ''ماں'' میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

بچوں پہ چلی گولی
ماں دیکھ کے یہ بولی
یہ دل کے مرے ٹکڑے
یوں روئیں مرے ہوتے
میں دُور کھڑی دیکھوں
یہ مجھ سے نہیں ہو گا
میداں میں نکل آئی
اک برق سی لہرائی
ہر دستِ ستم کانپا
بندوق بھی تھرائی
ہر سمت صدا گونجی
میں آتی ہوں، میں آئی
میں آتی ہوں، میں آئی ۱۰

حبیب جالب نے جابر اور آمر سیاستدانوں کو ہی نہیں للکارا بل کہ عام لوگوں کا درد بھی اُن کے سینے میں موجود تھا وہ حکمرانوں سے لڑے بھی عوام کی خاطر وہ کہیں بھی اور کسی پر بھی ظلم ہوتا دیکھتے ہیں تو وہی پر بول پڑتے ہیں۔ وہ چاہتے تو مقتدر طبقے کے ساتھ مل کر بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے حق کا ساتھ دیا ایک عام سے عام انسان کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں اُس پر ہونے والے ستم کو بیان کرتے ہیں۔ طبقاتی معاشرے میں مظلوم اور معصوم عوام پر ظلم جبر کے حوالے سے وہ بہت احساس انسان تھے۔ معاشرے میں وہ لوگ جن کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی بل کہ طوائف کا نام دے کر دھتکار دیا جاتا ہے۔ انہی میں سے دو مجبور و مظلوم رقاصاؤں، نیلو اور ممتاز سے آمرانہ بدسلوکی پر رنج و غم میں ڈوب کر جالب نے دو خوب صورت نظمیں

کہی تھیں۔ آمریت کے دور میں شہنشاہِ ایران کی خوشنودی کی خاطر نامور رقاصہ نیلو کو رقص کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ نیلو نے انکار کر دیا تھا۔ اس پر اُسے گرفتار کر کے محفلِ رقص میں لے آیا گیا تھا۔ نظم نیلو کے پہلا بند ملاحظہ ہو جو گیت کی صورت بھی گایا گیا:

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرات جو ہوئی تو کیوں کر
سایہ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے؟۱۱

اسی طرح دوسری رقاصہ ممتاز کے ایک ایسے تجربے سے پھوٹنے والی نظم کا پہلا مصرعہ ہی ہم سے بہت کچھ کہتا نظر آتا ہے حبیب جالب نے استعاراتی انداز نہیں اپنایا بلکہ براہ راست نام لیا اور بتایا کہ کس کے ساتھ کہاں کہاں اور کیسے ظلم و ستم ہوا ہے:

قصرِ شاہی سے یہ حکم صادر ہوا
لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو ۱۲

مزاحمت کی دو شکلیں ہمیشہ دو رویوں کی طرح آپس میں مدغم ہوتی ہیں۔ مزاحمت کی ایک شکل تو وہ ہے جو ہر جگہ پائی جاتی ہے یعنی کسی ظالم یا غاصب کے خلاف کھڑے ہو کر مزاحمت کرنا لیکن مزاحمت کی دوسری شکل ذرا پیچیدہ اور خالص داخلی ہے۔ یعنی منصفانہ اقدار کی آبیاری کرتے ہوئے اپنے نفس اور اپنی مفادات کے خلاف اس وقت تک مزاحمت کو جاری رکھنا جب تک کہ منصفانہ اقدار اس فرد کی ذاتی منفعت سے بازی نہ لے جائے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے اور اپنے اعزّا کی مفادات اور زندگیوں کی قربانی دے کر ان منصفانہ اقدار کا احیا کرنا ہوتا ہے۔ ادب اور سماج میں مزاحمت کی یہ دونوں شکلیں انتہائی طاقتور طریقے سے عیاں ہیں۔ اور ان دونوں رویوں کے انسانی نفسیات پر گہرے نقوش ہیں۔ مزاحمت کی یہ دونوں شکلیں حبیب جالب کے ہاں ملتی ہیں۔

حبیب جالب کی ایسی بیسیوں نظمیں ہیں جن میں مزاحمتی رنگ پایا جاتا ہے۔ اُن کی نظموں میں جو بہت زیادہ زیرِ بحث آتی رہی خاص کر اس دور میں "جمہوریت"، "اپنی جنگ رہے گی"، "بھیک نہ مانگو"، "مشیر"، "وزیرانِ کرام" اور "وطن کو کچھ نہیں خطرہ" کی سی نظموں میں جالب نے آمریت کو اپنے بے باک اور دوٹوک انداز میں ظلم کی رات اور ایوب آمریت کے حامیوں کے استدلال کو کذب وافترا قرار دیا۔ اس طرح حبیب جالب کی ساری زندگی مسلسل جدوجہد سے بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے ہر طرح کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سماجی بھلائی کے خواب دیکھے اور اُن کا بلا خوف و خطر ڈنکے کے چوٹ پر اظہار بھی کیا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے متکبر اور جابر حکمران نے اُن کے سامنے ہمت ہار گئے تھے۔ نواب امیر محمد خان آف کالا باغ ایوب خان کے دورِ آمریت کی انتہائی خونخوار شخصیت تھے۔ اُنھوں نے پاکستان میں ظلم واستبداد کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس دور میں حبیب جالب حق وانصاف کی ایک توانا اور ناقابلِ تسخیر آواز تھی۔ حبیب جالب کی مزاحمت اور فرانس کے دانشور سارتر کی مزاحمت ایک جیسی تھی وہ اس طرح کہ فرانس کے معروف دانشور سارتر الجائزر پر فرانسیسی تسلط کے خلاف اپنے ہی ملک کی حکومت کو ہدف تنقید بناتا ہے اور احتجاجی تحریک کی قیادت کرتا ہے حالات بگڑ جانے باوجود فرانس کے حاکم وقت نے اسے اس بنیاد پر گرفتار کرنے سے انکار کر دیا کہ سارتر فرانسی دانشور ہے اور پورے فرانس کے دانش وروں کو ہتھکڑیاں نہیں پہنائی جاسکتی۔ بالکل اسی طرح مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ اپنی تمام تر جاگیر دارانہ رعونت اور سرکاری طمطراق کے باوجود جالب کی آواز کو خاموشی کے زنداں میں اسیر کرنے میں سراسر ناکام رہے تھے۔ خود نواب آف کالا باغ نے اپنی اس ناکامی کا اعتراف درج ذیل الفاظ میں کیا تھا:

> "میں اپنے دورِ حکومت میں صرف ایک شخص سے عاجز آیا اور وہ تھا حبیب جالب۔ میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا۔ اگر اس کی زمین ہوتی تو میں چھین لیتا۔ جائیداد ہوتی تو ضبط کر لیتا۔ کھیت ہوتے تو جلا ڈالتا، سرمایہ ہوتا تو تنگی کا ناچ نچا دیتا مگر اس کے پاس شاعری تھی اور شاعر کا ضمیر، جس کا میں کچھ نہ بگاڑ سکا۔"[13]

یہی وجہ ہے کہ حبیب جالب کے کی شاعری نعرے کے قریب ہونے کے باوجود بہت سے مزاحمتی شاعروں کی خشک اور بے رس شاعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ اثر پذیر ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ انہوں نے صرف کتابی سطح پر ترقی پسند فکر سے متاثر ہونے کی بجائے تجربات کی سچائی اور داخلی سوز سے اپنی شاعری کو پروان چڑھایا۔

حوالہ جات

---

1 ابرار احمد، مزاحمتی ادب (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۰۷۸۔

2 جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۳۲۔

3 سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ (لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۶ء)، ص ۳۰۔

4 احمد جاوید، مشمولہ: ادبیات، (اسلام آباد، ۱۹۹۴ء)، شمارہ ۳۰: ۲۷، ص ۲۹۶۔

5 حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، (لاہور: ماورا پبلی شرز، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۲۹۔

6 ایضاً۔

7 ایضاً، ص ۱۳۷۔

8 ایضاً، ص ۱۶۲۔

9 ایضاً، ص ۱۶۱۔

10 ایضاً، ص ۱۹۰: ۱۸۹۔

11 ایضاً، ص ۲۰۲۔

12 ایضاً، ص ۳۳۷۔

13 سعید پرویز، حبیب جالب: شاعرِ شعلہ نوا، (کراچی: مکتبہ دانیال، ستمبر ۱۹۹۶ء)، ص ۳۸۔